

Azad, Abul Kalam, maulana

حیاتِ سرمد

Hayāt-i Sarmad



”عشق کی شورشِ انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں۔ ہر عاشق گو قیس نہ ہو مگر مجنوں
ضرور ہوتا ہے اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لئے جگہ
خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذبِ جنون اس طرح چھایا کہ
ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاع تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیوی تعلقات
میں سجم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی، بالآخر اس بوجھ سے پاؤں ہلکا ہو گیا کہ
پابندیاں تو مدعیانِ ہیشامی کے لئے ہیں۔“

ابوالکلام آزاد

تنویر پبلشرز - باغِ گونگے نواب - لکھنؤ

عرض ناشر

سرمد کی شہادت کا سانحہ (۱۶۵۹ء) عہد عالمگیری کا ایک یادگار المیہ ہے۔ مولانا ابوالکلامؒ نے یہ خونی داستان اپنے مخصوص انداز میں خواجہ حسن نظامی صاحب کی فرمائش پر اوائل سن ۱۹۱۱ء میں سرمد قلم کرنا شروع کی، اور اس کی پہلی قسط خواجہ صاحب کے نام کلکتہ روانہ کر دی، دوسری قسط دو تین دن کے وقفہ کے بعد خواجہ صاحب کو بھیجی، مگر وہ ضائع ہو گئی، اس کے متعلق مولانا نے واحدی صاحب کو لکھا۔

”واحدی صاحب تسلیم مضمون تصدقاً اناتام بھیجا تھا کہ بیماری اور سفر کی حالت میں جتنے صفحے قلم سے نکلے انہی کو غنیمت سمجھ کر بھیج دینا مناسب نظر آیا، تین دن کے بعد پھر کچھ ہملت ملی تو باقی مضمون مرتب کیا اور وہ بھی خواجہ صاحب کے نام کلکتہ بھیج دیا۔ حیرت ہے کہ اب تک صرف پہلی قسط کیوں بھیجی گئی، بہر کیف اگر عناصؒ ہو گیا ہو تو اب نہ اتنی ہملت ہے کہ پھر لکھوں اور نہ اس میں اتنی اہمیت ہے کہ دوبارہ دقت عرض کیا جائے، یہ بھی خواجہ صاحب کا اصرار تھا کہ سرمد کے حالات لکھیے، ورنہ تاریخ کے سیکڑوں اور باب اجتہاد و تجدید شکوہ سنج بے التفاتی ہیں انھیں چھوڑ کر سرمد وغیرہ پر کون دقت عناصؒ کرے، یاد فرمائی کا شکریہ۔“

لیکن مولانا کو داستان کی ناتمامی کا احساس رہا اور ۳۰ جون سن ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے خواجہ صاحب کو لکھا۔

”کے تو سرمد کا بقیہ مضمون لکھ بیجوں۔ بیٹی سے آتے ہوئے سرمد یاد آگئے ان کی ربا عجات کا دیوان ساتھ لے لیا تھا۔ کبھی نظر پڑتی ہے تو خیالات موجزن

ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو قلمبند کردہ کے بھیج دیں۔“

مولانا نے یہ مضمون ۹۔ جولائی ۱۹۱۱ء تک دوبارہ مکمل کر کے بھیج دیا اور پہلی مرتبہ اس نے پوری صحت کے ساتھ اشاعت کا جامہ پہنا، اس کے بعد سے اب تک یہ ناقص حالت میں کئی بار چھپ کر خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کرتا رہا۔ مولانا خود زندگی بھر دارورسن کا کھیل کھیلتے رہے تھے، بیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں میں اندرون اور بیرون ہند میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے سرمد شہید کو مولانا کے تصور میں اکثر زندہ رکھا ہو گا۔ مولانا کے اسلوب نے اس تصور سے مل کر اس مضمون میں جو کیفیت پیدا کر دی ہے اس کا اندازہ ارباب دل ہی لگا سکتے ہیں، خواجہ حسن نظامی نے غلط نہیں لکھا کہ یہ مقالہ ”مقامات درویشی پر ایک ستانہ اور البیلا خطبہ ہے۔“

اب ہم یہ مکمل مقالہ ارباب نظر کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

عمریت کہ افسانہ منظور کن شد

من از سر نو جلوہ دہم دارورسن را



سرد شہید

آنا نیکہ غم تو برگزیدہ ہمہ در کوئے شہادت آرمید ہمہ
 در معرکہ دو کون فتح از عشق است یا آنکہ سپاہ او شہید نہ ہمہ

عہد عالمگیری میں اور اُس کے بعد جس قدر فارسی تذکرے لکھے گئے ہیں، ان میں بالعموم سرد کے عنوان سے چند سطریں ملتی ہیں لیکن اول توقیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں ان کے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافہ کے لئے پورا پتہ بھی نہ میسر آتا۔ اور پھر جو کچھ ہوں، وقت یہ ہے کہ اس وقت سامنے نہیں، میں نے عہد عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث واقعات کے ضمن میں کچھ حالات مل جائیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولیکل غارت انہیوں نے غلام روک لیا تھا۔ مرزا محمد کاظم نے عالمگیر کے حکم سے تمام سوانح و حالات بقیہ نینت بسند کرنے شروع کئے، لیکن صرف دس سال ہی کے حالات لکھے تھے کہ حکایتیہ سلسلہ بند کر دیا گیا، اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب غنایت اللہ کو خیال تکمیل ہوا۔ اس کے اشارے سے مستعد خاں نے بقیہ چالیس سال کے سوانح قلمبند کیے اور ابتدائی دہائیہ مجموعہ کا انتخاب شامل کر کے مائثر عالمگیری نامہ لکھنے میں نے سلسلہ کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرد کی شہادت کا سن ہے، مگر حالات کا ملنا تو ایک طرت معلوم ہوتا ہے کہ پوری استعداد کے ساتھ تاریخ کے صفحات کو بچایا گیا ہے کہ اس شہید عشق کے جامہ خوشچکاں کے قطرہ افشانی سے حاشیہ پر کہیں دھتے نہ پڑ جائیں، لطف یہ کہ اسی سال

شاہ عباس ثانی اور حسین پاشا رومی (غالباً دوائی حجاز) کے سفر آئے تھے، ان کے حالات کی سطریں صفحے کی انتہا تک پہنچ کر بھی آگے بڑھنے سے نہیں رکتیں، خیر یہ حالات بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے تھے، اطرہ برس یہ کہ اس سال نواح دہلی میں کہیں چند لڑکے شاہ دوزیر کی نقل کھیل رہے تھے، ان میں ایک کو توال اور ایک مجرم بھی تھا۔ مصنوعی کو توال نے غیظ و غصہ میں آکر مصنوعی مجرم کو اصلی سزا دیدی۔ نصف صفحہ کے قریب اس حادثہ عظیم اور داستان اہم کی تذکر کیا گیا۔ مؤرخ کی نظر کا جب یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے قصوں کے هجوم میں سرد بیچارے کی فحش کیونکر نظر آتی۔

خانی خاں کی منتخب اللباب عند مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے جس نے ادیبانِ کتب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں گویا صرف ہی زمانہ موقوف کتاب ہے۔ قیاس کہتا تھا کہ اس نے یہ واقعہ نظر انداز نہ کر دیا ہوگا کیونکہ عالمگیری عہد کا قلم اس کے ہاتھ میں نہ تھا، جس کو ہر قدم پر روک لیے جانے کا اندیشہ ہو، مگر جب اسے کھولا تو ہزار صفحے کے سوانح میں ایک لفظ بھی سرد کی نسبت نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا از مؤرخ کا قلم ہے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی باگ میں کتنی گرہیں ڈال دی گئی تھیں۔

سرد کی شہادت کا وہی سن ہے جس سن میں کوچ بہار اور آسام پر چڑھائی کی گئی، اس لئے دونوں تاریخوں نے اس سال کے حالات کا نصف حصہ اسی فتحیابی کی داستان سرائی میں صرف کر دیا، فتح آسام کی اہمیت کے بیان میں شک نہیں، مگر متعدد خاں کو کیا معلوم تھا کہ تماشا گاہ عالم میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو اس شادمانی فتح پر غلط انداز نظر نہ ڈالیں گی مگر اس غم اثر شکست پر ہمیشہ خوشی کہاں رہیں گی، جو ایک محبوبوں لیلائے حقیقت کو دار پر کھینچ کر معرکہ حق پرستی میں عالمگیر کو نصیب ہوئی۔

قصہ مختصر بائیں ہمہ دو کتابیں ایسی پیش نظر ہیں جن سے زیادہ تر معتبر راوی
 سرمد کے لئے نہیں ہو سکتے، پہلا شخص شیر خاں بودھی (مصنف مرآۃ الخیال)
 ہے جو بنیر کسی واسطے کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھتا ہے۔ کیونکہ اسی عہد کا
 تذکرہ نویس ہے، اس کا تذکرہ مرآۃ الخیال میرے پاس ہے۔ دوسرا شخص علی قلی خاں
 داغستانی عہد محمد شاہ کے امراء میں سے ہے۔ جس نے نہایت مفصل و حقیقہ سے
 شعرائے فارسی کا تذکرہ ریاض الشعراء مرتب کیا، اس کا علمی نسخہ مصنف ایشیا ناک
 سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے اور زیادہ تر حالات میں نے اسی سے
 لئے ہیں، یہ گویا عہد محمد شاہ میں لکھا گیا ہے لیکن سرمد کے حالات کے لئے ایک
 واسطے سے زیادہ دُور نہیں، اس کے علاوہ تمام تذکروں نے جو کچھ لکھا ہے
 ذہن میں رکھ نہ کچھ تو محفوظ ہے۔ ایشیا ناک سوسائٹی میں ایک بیاض قلمی عہد
 عالمگیری ثانی کے کسی خوش مذاق شاعر سراج الدین سراج کی جمع کی ہوئی ہے آپ
 میں کہیں کہیں حالات بھی دیے ہیں، غرض کہ گلدستہ تو بنا مگر چند پتوں اور
 پستکھڑیوں کو دامن میں لے لیا ہے کہ مشہد سرمد میں جاؤں تو خانی ہاتھ
 کیا جاؤں۔

سرمد کی قومیت اور مذہب | سرمد کی اصل قومیت اور مذہب کو کوئی
 صاف نہیں بتا سکتا، مصنف مرآۃ الخیال کا
 بیان ہے کہ "اصلش از فرنگستان دارمنی بود"۔ مگر باقی تذکرے یہودی الاصل
 بتاتے ہیں۔ والد داغستانی اس پر اتنا اور بڑھاتا ہے کہ وطن کا شان تھا
 مگر یہ اختلاف باہم تناقض نہیں، کیونکہ ایران میں قدیم سے اڑنیوں کی وسیع
 آبادی موجود ہے جو بالعموم مسیحی اور بعض بعض یہودی ہیں، اب تو انھوں نے پھر
 یورپین طرز معاشرت اختیار کر لی ہے اور تحصیل علوم جدیدہ میں تمام ایرانی جماعتوں

سے پیشرو ہیں۔ ایک صدی پیشتر تک ان میں مذہب کے سوا کوئی بات مسلمانوں سے مختلف نہ تھی، ان میں سے بعض اسلامی علوم و آداب کو اس حد تک حاصل کرتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ شخصیتوں میں شریک ہو سکتے تھے، چنانچہ تذکروں میں متعدد شعراء کے حالات ملتے ہیں جو ارمینی اور عجمی تھے مگر ان کے اشعار ایران کے مسلمان غمخیز گو شعراء سے کسی طرح کم نہیں، سرمد کا خاندان بھی ارمینی اور یہودی ہو گا۔ کاشان میں متوطن ہوں گے، ارمینی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو خیال پیدا ہوا ہو گا کہ فرنگی ہے اور ایک باہر کے غیر معروف آدمی کی نسبت ایسا دھوکا ہونا کچھ عجیب نہیں۔

آفتاب جب چمکتا ہے تو باخ و سپمن کو نہیں ڈھونڈتا کہ اپنی کرنوں کا انھیں شمیم بناؤں، اس کا فیضان ضو بخش مبدائی فیض کی طرح فیض عام ہے۔ محلسرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر اس کی ضوافشانی سے چمک اُٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خفاک درختوں کی شاخوں سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میرا مقصد نظام شمسی کے مرکز سے نہیں بلکہ آفتاب اسلام سے ہے۔ اس اقیانوس سحلی کی لہریں اُٹھیں تو انھوں نے پہلے تو سہم و خون اور قوم و مردوم کے قائم کئے ہوئے اقبالیات کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا، پھر سیرابی کا وقت آیا تو احزاب قریش اور ارقطے حبش، بطحا و شرب اور عجم و فرنگ، تاجدارِ خستہ و بادشاہینِ عرب، ادنیٰ و اعلیٰ، دور و نزدیک سب کو ایکساں طور پر شریک فیض کیا، صرف صلاحیت اور اثر پذیری معیارِ فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدر صلاحیت حصہ یا بھٹی، بوجہ قریشی تھا اور خزائن کے پاس مگر مدت العمر محروم رہا۔ بلال حبشیؓ اور صہب رومیؓ تھے، پھر کس قدر دور مگر ان کے دامن دیکھے تو مالامال تھے۔

ابیرم کہاں نہیں برستا، مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بن جاتی۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گورہ نہ ہوا تھا

یہ اسی فیاض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو بہ اوغشا اسلام تھا مگر اس کی کوئی نصیب
نہیں رہی۔ نو مسلم قومیں جو دور دراز ملکوں سے آئی تھیں۔ ہر علم و فن میں اس طرح
دست بر علم ہوئیں کہ خود عرب کو ان کے نیے اپنی صفیں توڑ دینی پڑیں۔ یہاں تک کہ
آج تراجم و رجال کی کتابیں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کوئی علم و فن ایسا نظر نہیں آتا جس پر
نو مسلم قوموں کا تسلط نہ ہو، حتیٰ کہ فقر و تصوف جس کی مذہب کے مانے میں پرورش
ہوئی ہے اس کی تمارت بھی نو مسلم اشخاص کی خود فروشیوں کی منت پذیر سی سے
آزاد نہیں، بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اس
طرح عام تھی کہ نسب و قومیت کے امتیازات کو اس میں دخل نہ تھا، محرم کی سبیلیں
جب لگائی جاتی ہیں تو پیاسوں کی تلاش ہوتی ہے، زریں کلاہوں اور ریشمی
قباؤں پر نظر نہیں پڑتی۔ سرچشمہ فیضان الہی بھی لشکانِ محبت کو ڈھونڈتا ہے
نسب و قومیت اور رنگ و خاندان سے اُسے کیا سروکار ہے۔

اس عام فیض بخشی کی ایک نمایاں نظیر سرمد کی سوا سخمیری بھی ہے، وہ ایران
کے کسی ازبکی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اور مذہباً یہودی یا مسیحی تھا، آغاز عمر ہی
میں فیضان الہی کی نظر انتخاب پڑی اور جذبِ ہدایت کی کشش نے مشرف
بہ اسلام کیا۔

خاندانی نام | خاندانی نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول
اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا، عام طور پر صرف سرمد ہی
کے لقب سے تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے اور سچ یہ ہے کہ سرمد کا بے نام ہو جانا

جائے تعجب نہیں، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شرع میں بے نام و نشان دہن تو رکن الدین بلکہ شرط ایمان ہے۔

باد جو دت ذمہ آواز نیامد کہ منہم

لیکن بعض تذکروں میں سعید اے سرمد کے عنوان سے اس کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسلامی نام کا ایک مجز و شاید لفظ سعید ہوگا، جو بقاعدہ تخفیف تخلص کے ساتھ مشہور ہو گیا۔

تحصیل علمی | تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں، لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ علم و فضل اور عربیت میں درجہ کمال رکھتا تھا، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تحصیل علمی اس زمانے کے نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔

ابتدائی پیشہ | ابتدائی پیشہ تجارت تھا، ایران سے تجارتی اموال لے کر ہندستان کی طرف بڑھا، اس زمانہ میں علم و فن کی طرح جنس و

منازع کی بھی نمائش گاہ ہندستان تھا، مگر یہ جوان تاجر جو بے خبر ہندستان کی طرف قدم ران تھا، نہیں جانتا تھا کہ وہاں پہنچ کر کس تجارت میں اسے اپنا تمام سرمایہ لگایا بیٹا پڑے گا، وہ شاید ایرانی مصنوعات فروخت کر کے ہندستان کی قیمتی اجناس اور محسود عالم کانوں کے لعل و الماس خریدنا چاہتا تھا، لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ قضا و قدر اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے، تجارت تو اُسے بہر صورت آخر حیات تک کرنی پڑے گی مگر ذخارفِ مادے کی تجارت گاہوں میں نہیں، بازارِ حسن و عشق میں۔ جہاں چاند می سونے کی جگہ دلِ صدا پارہ اور جگرِ صد زخم خوردہ کا سکہ رائج ہے، اور جہاں کی تجارت یہ ہے کہ ممبر و شکیب، ہوش و خرد۔ دل و جگر دے کر ایک غلط اندازِ نظر، ایک چینِ حبیب، ایک تغافلِ پیشہ نگاہ خرید لیجیے کہ اس سہل قیمت پر یہ مناعِ مشکل مفت ہے۔

صد ملکِ دل بہ نیم نگہ میواں خرید
خوہاں دریں معاملہ تقصیر نمی کنند

اور صرف اتنا ہی نہیں کیونکہ یہ تو اس بازار کی نمائندگی اور سامنے کی چیل چیل ہے،
اگر بہت قدم آگے بڑھائے تو پھر وہ آخری سودا بھی کرنا پڑے گا جس کی قیمت
نقد جان ہے اور جس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیات کا بھر پور پیمانہ خون شہادت کے
ایک لبریز جام سے بدل لیا جاتا ہے اور دشمن دشمن کے معاوضہ میں اگر دھت
لے تو کون خیرہ نظر ہے جو اس متاع کا مشتری نہ ہو۔

دو عالم نقد جاں بردست دارند
بیازارے، کہ سوداے تو با شذر

اس زمانے میں ایرانی سیاح عموماً سندھ ہو کر ہندستان آتے تھے۔ سندھ کے شہر
میں ٹھٹھہ ایک مشہور شہر تھا جس کو اب نے جغرافیہ میں گننامی کا خانہ نصیب ہوا
ہے۔ اسی ٹھٹھہ وہ سیناے مقدس تھا جو سرمد کے لئے تجلی گاہ امین بنا، اور
ایلائے حسن نے اول اول اپنے چہرے سے نقاب الٹی، کہتے ہیں کہ ایک بلند و
بر کا تھا جس کی چشم کافرنے یہ انصوف طرازی کی، اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں کیونکہ
عشق نیزہ دونوں کیونکہ نیم کرنے میں بخیمہ گر کی سوئی اور جلا دی تیغ دونوں برابر ہیں۔
یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پرواہ وہی نیازہ گراہ جنس غرضمند ہوتا ہے، پھر
جو لوگ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطر زندہ رکھے ہوئے خریدار دھڑکتے ہوتے ہوں
انھیں تو حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں یہ معلوم ہوتا ہو
کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاعِ دل کی کس پیر سی سے تنگ آگیا تھا اور
خود خریدار کہ بے تابانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اٹھا کے دیکھا تک
نہیں کہ کون ہے اور کیا لے کے آیا ہے؟ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاعِ ارزاق

کی ایک چشم سحر کار طالب ہے اور بلاتامل یہ سودا منظور کر لیا۔

دلال عشق بود و خسریدار جافستاں

خود فروختیم چه سودا ہمار سید

سرمہ کو آئندہ جس صحرا میں باد یہ پانی گرنی تھی یہ اس کی طرف پہلا قدم تھا، اور
کچھ سرمہ ہی کی خصوصیت نہیں، عشق خواہ کسی عنوان ہو منزل حقیقت کا ہمیشہ سے
پہلا قدم ہے بلکہ یہ کنا بھی منزل ہے، منزل حقیقت کا کیا ذکر، عشق تو وہ دروازہ ہے
جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا، جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں
میں تری نہیں، اس کو معنی انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ زائد
مشکف بھی بائیں ہمہ تعبیر یہ نقشب۔ جب اپنے زامیہ عبادت میں سرمہ زانو ہوتا
تو حور و غلام کی مسکراہٹ سے لطف لے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی ہوشنگ شاہ مجھے
گوشتوں اور حجر و ل میں دوست کو ڈھونڈتے ہیں انھیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں ہے

خود و جنت جلوہ برزا ہد ہد در راہ دوست

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سودا از دکان حقیقت شاہد اذنی کے جاں دادہ ہیں،

انھیں بھی مجازی کو چوں میں درو دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے۔ کیونکہ دل
جب تک لذت آشنا لے دردنہ ہو رن کا ایک ٹکڑا ہے جس کو پانی بننے دیکھا ہو

گربن آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی، حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے۔ اور
عشق کا کیسا آتشکدہ ہو۔ یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس
آتشکدہ پر بند چڑھا دیں اور پھر وہن ہو ابھی دیتے جائیں کہ کیش شعلوں کی بھڑک کہ نہ ہو جائے

افسردہ رانصیب نباشد دل کباب

آں مائد اس نوالہ کہ ہماں آتش است

عشق اسی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں مگر انسان آب و گل کے تعلق میں اس طرح پایہ نگل ہے کہ جب تک دل پر درد کو کوئی محکمہ چوٹ نہ لگے ادھر سے ٹوٹ نہیں سکتا، کبھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے تو جب تک اڑائیے نہیں، نہیں اڑتی۔ انسان کا دل بھی جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔ عشق کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دل فریبیوں کی جکڑ ہی ہوئی نہ بخیروں کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقہ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی۔ اسی درد کے لئے عارف عطار بے قرار و فغاں ساز ہے کہ

کفر کا نسر را و دیں دیندار را

ذرہ دردے دل عطار را

خوگر کہ جس مُردہ دل کو کبھی یہ وقت خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بند نقاب کے ٹوٹنے کے تصور میں اپنے خرمین ہوش و حواس پر بجلیاں گراے اس کو شاہ حقیقت کا نظارہ حواس ظاہری سے کب کھو سکتا ہے؟ جس افسردہ تنفس نے اپنی عزیز اور شیریں باتیں کسی نرگس خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں۔ اس کو معشوق حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہوں گی؟ جس خیرہ دماغ نے اپنے سرایہ عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج ادائیگوں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو وہ خود پسندی اور وہ خود آرائی کے بُت کو کیوں کر توڑ سکتا ہے؟ جس بے جس کو کسی پیکر حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت اور لایعقل نہ کر دیا ہو اس کو ساز اذنی کی

نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے، غرض کہ جس نصیب کو کسی مست حُسن کی نگاہ
 بے محابا بخود نہ کر سکی اُسے جلوہ طور پر کیوں بخش آنے لگا؟ جو فیتلہ پہلے جل چکا
 ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے لیکن نئے فیتلہ کو بہت دیر تک آگ کھلانی پڑتی ہے۔
 محبت بادل غمیدہ الفت بیشتر گریہ و
 چراغے را کہ دودے بہت در زرد و زگرید

نظر میں اگر جو یائے حُسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کی کیوں منتظر ہیں نہیں
 تو پردہ نقاب کی زیبائی ہی پر لٹ جانا چاہیے کنعان کی گم کردہ سپر آنکھوں نے
 جلوہ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیرا بہن یوسفی کی بو پاتے ہی کھل گئیں۔ کہ اِنی
 لَا جِدُ دِیْجَ یُوسُفَ کَوَ لَا اَنْ تَغْتَدُوْنَ یہی وجہ ہے کہ منجانب حقیقت
 میں جب مجلس گرم ہوتی ہے تو پہلے جام و مینا کا دور چلتا ہے اور جب اس کے
 تلخ گھونٹ گوارہ ہو جاتے ہیں تو پھر ساقی اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے
 کہ اب جام و سبو کی ضرورت نہیں، اسکی نگاہ شہ خیز سے خود رفتگی و خود گزشتگی
 حاصل کیجئے

مے حاجت نیست ستم را

در چشم تو ناخار باشد

سرمد کے آگے بھی یہ جام رکھا گیا اور جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے
 ہاتھ کی بخنائی پر منحصر ہے۔ اس لئے ہم اس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے جس
 کی نگاہ نیلی روش نے سرمد کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیاس و فرما کی قسمت
 کہاں سے لائے؟ سرمد کے لیے کا زیادہ سے زیادہ حال جو معلوم ہوتا ہے ہی
 ہے کہ ایک ہندو لڑکا تھا اور غور کیجئے تو یہ بھی بہت ہے۔ کیونکہ بازار عشق میں
 جب سودا چکایا جاتا ہے تو یہ کب دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا

قیمت مل رہی ہے ۶۔

مرا فروخت محبت دے نی دام
کہ مشتری چس است وہائے با چند است

ارباب تذکرہ اس میں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا۔ والد داغستانی لکھتا ہے کہ بندر صورت میں۔ اور آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرے میں عظیم آباد پٹنہ لکھا ہے لیکن ان سب میں مراۃ الخيال قدیم العهد ہے اور اس کا بیان ہے کہ ”در اثنائے تجارت بشہرتہ افتاد۔ ہر ہند و پسرے عاشق گشت“ اس لئے ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بہر کیف سبلی کہیں گری ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ رہقان کے خرم سوختہ کا کیا حال ہوا۔ ۶

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں۔ ہر عاشق کو فیس نہ ہو مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے اور جب عشق آسمان ہے تو عقل و حواس سے کتنا ہے کہ میرے لئے جگہ خالی کر دو۔ سرمہ پر بھی یہی حالت طاری ہوتی اور جذبہ جنوں اس طرح چھایا کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاع تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیوی تعلقات میں سے جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی، بالآخر اس بوجھ سے بھی پاؤں ہلکا ہو گیا کہ پابندیاں تو دیوان ہوشیاری کے لئے ہیں مجنوں لا عقل مرفوع اقلع ہوتے ہیں ۷

خطا ہر دم دیوانہ کس نہی گیسر

جنوں نہاری و آشفہ خطا ایہ نجاست

بیاباں نور دی | بیاباں نور دی عالم عشق کی سیر و سیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل، تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے۔ ”مجنوں جو وصف عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ صحر اگر دی میں کوئی حرفت نہیں۔ سر نہ نے

بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی، سندھ کے ریگزاروں سے تلوے گرم کئے۔
ہندستان کے گرم دوسروں کو یکساں ٹھنڈائی میں کاٹ دیا۔ اور بالآخر جب یہ
عقدہ کھلا کہ

بہودہ چہرہ اور طلبش میگر دی،
بنشیں! اگر او خداست خود می آید (تسرد)

تو پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی، جہاں بیٹھ کر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے
لیکن جب نتیجہ یہی تھا تو پھر یہ بیاباں نور دی کیوں تھی؟ مگر نہیں خود کہ چکا ہوں
کہ یہ بھی عشق کے قانون کمال میں داخل ہے اور عشق کے قانون میں استثناء نہیں
یکے از دستگیر بہاے عشق است

عزیزاں را بخوار می بر کشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ خنقریب بساط ہند پر عالمگیرؒ ایک نئی چال چلنے والا
تھا اور شاہ جہانی حکومت کا عہد آخری اور شاہزادہ داراشکوہ دلیعہ
سلطنت تھا، سلسلہ مغلیہ میں داراشکوہ ایک عجیب طبیعت و ماخ کا شخص گزرا ہے،
اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا، اس لئے
اصلی تصویر پولیکل چالوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی، وہ ابتداء سے درویش دوست
اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقرا اور ارباب تصوف کی صحبت میں
رہتا تھا، اسکی بعض تحریرات جو دست برد حوادث سے بچ گئی ہیں بتلاتی ہیں کہ انکا
لکھنے والا بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں، اس کے صاحب ذوق ہونے کا بڑا
ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں ویر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی اور جس نیاز کیشی کے
ساتھ مسلمان فقرا کے آگے سر جھکا تا تھا۔ ایسی ہی عقیدت ہندو درویشوں سے بھی
رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس

عالم میں بھی کفر و اسلام کی تمیز ہو تو پھر احمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا با پروانہ کو
تو شمع ڈھونڈھنی چاہیے۔ اگر صرف شمع حرم ہی کا شکار ہے تو سوز و غم طبعی میں
کامل نہیں ہے

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر

پر داند چو از حرم و دیر نداند

سرمد جوش جنوں میں پھرتا ہوا جب شاہ جہان آباد دہلی پہنچا
تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لے جائیں کیونکہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی میخانہ
میں ملے گا۔ مصنف مرآۃ الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صفت اولین کا طالب
ہے لکھتا ہے :-

”چوں خاطر سلطان دارا شکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت

بوسے و رگرفت۔“

بیچارہ علی شہید بھی ہوشیاری و دیوانگی ہی کی بحث میں سر مار رہا ہے، اسے کیا خبر
کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جن کے ایک پتے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو
دوسرا پتہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھکا سکتا۔ اور پھر ایسے
خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش و حواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرہ جنون
مل سکتا ہو تو بازارِ یوسف کی طرح ہر طرزی سے ہجوم کریں۔ ہر کیف خواہ کچھ ہو۔ عالمگیر
کی ہوشیاری سے تو ہمیں دارا شکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو
تیغ ہوشیاری کشتگانِ حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کے
رگمے گردن سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ شاید دارا شکوہ بھی عالمگیر جیسے
ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آگیا تھا۔ اسی لئے اُس نے سرمد جیسے مجانین کی

دارا، مصنف مرآۃ الخیال

صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔

غرض کہ سہ ماہ داراشکوہ کی صحبت میں رہنے لگا اور اُسے بھی سہ ماہ سے کمال عقیدت تھی۔ اس زمانہ میں عشق کی شورش انگیزیاں کبھی کبھی اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتی تھیں لیکن چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہو، اس لئے شاہجہان آباد سے نکل نہیں سکتا تھا یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور داراشکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا۔ اور ایک عرصہ کی شورش و غوریزی کے بعد ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر اورنگ زیب تخت نشین حکومت ہوا۔ یہ زمانہ داراشکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے لئے خود داراشکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو داراشکوہ کے ساتھ نکل گئے اور جو رہ گئے انھوں نے اپنے آپ کو کشتی طوفان میں پایا۔ لیکن اس دین بے خبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ دنیا کو نظر اٹھا کے دیکھے اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے کیوں کر نکلتا۔ کیونکہ بایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں، آخری منزل طے کر فی باقی ہے اور وہ ہیں پیش آنے والی ہے۔

بیک دوزخ سم کہ خوردن عشق ہن مباش

کہ درمیں گمہ ابرو کمان کش ست ہنوز

سہ ماہ کی شہادت | سہ ماہ کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتلائے ہیں۔ تذکرۃ الانجال میں ہے کہ سہ ماہ کی اس رباعی پر رجبہ پورٹا

شرع کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراج جسمانی سے

انکار لازم آتا ہے

ہر کس کہ سہ تحقیقش پادشہ | ادھن تر از سپہر ہنادرشہ

ملا گوید کہ رفلاک شد احمد | سہ ماہ گوید فلک احمد درشہ

مگر اس ترک سادہ کو نقیبانہ جنگ و جدل سے کیا سروکار تھا۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تاکہ نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور و غوغا کر رہے ہیں ؟ وہ تو اس عالم میں تھا جہاں ان اقرار و انکار کی بحثوں کی آواز بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

در عجبانہائے طور عشق حکمتا کم است
عقل را با مصلحت اندیشی و محنوں چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیرؒ کی نظروں میں تو سراسر یہ کاسب سے بڑا جرم دارا شکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پائیس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹیکل ایسا ب سے ہوئی ہیں انھیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپایا گیا ہے۔ جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عریانی و برہنگی کو کہ خلاف رسم شرع ہے بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رہائی سے نتیجہ نکالا کہ معراج جسمانی کا منکر ہے۔ ملا قوی اس زمانہ میں قاضی القضاۃ تھے عالمگیرؒ نے انھیں سرحد کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں، ملا صاحب نے کہا کہ باوجود کامل علم و فضل برہنہ و مکشوف العورہ رہنا کس عذر پر مبنی ہے سرحد نے کہا کیا کروں شیطان قوی ہے اور فی البدیہہ یہ رہائی پڑھی۔

خوش بالائے کرد و چنین پست مرا چشمے بد و جام بردہ از دست مرا
اد در بغل من ست و من در طلبش دزدے بخیمے برہنہ کرد بہت مرا
ملا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی، کیونکہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی مگر خود ان کے وجود اسلام جہارت کی سخت اہانت ہوئی، یعنی ان کا اسم سامی ابلیس لعین کا وصف قرار پایا۔ بہر کیف انھوں نے عالمگیرؒ سے آکر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آ گیا ہے اور قلہ ان کھولنا چاہا کہ علمائے ظاہر کی تیغ خون آشام اسی نیام میں رہتی ہے لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشیوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہ سمجھا، وہ

خوب سمجھتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخص نہیں ہے جس کا قتل ایک عامہ المرد و واقعہ سمجھا جائے گا، علم و فضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمت انہیں اور رجوع خلائق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہان آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے، اس لئے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں فقہاء کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا، اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتوؤں کا دامنگیر ہے۔ اسلام کی تاریخ کو کہیں سے پڑھو۔ سیکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ بادشاہ جب خوزیری پر آتا تھا تو دارالافتاء کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے۔ صوفیہ اور ارباب وطن پر منحصر نہیں، علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ میں اسرار حقیقت کے قریب ہوئے فقہاء کے ہاتھوں انھیں مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور بالآخر سردے کے نجات پائی، سرد بھی اسی تیغ کا شہید ہے۔

چوآن میر و نظیری خونیں کفن بجمشتر
خلقے فخال کمنند کہ اس دادخواہ کیمیت

آئینہ الامریہ قرار پایا کہ سرمد کو علماء و فضلاء عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے اور تمام علماء کی جو رائے قائم ہو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمد کو بلا یا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا اور پوچھا لوگ کہتے ہیں کہ سرمد نے دارالاشکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ سرمد نے کہا۔ ہاں اور وہ مژدہ درست نکلا کہ اُسے ابدی سلطنت کی تاج پوشی نصیب ہوئی۔ عامہ بندوں نے کہا کہ بڑی شریعت کے خلاف ہے اور اس کے لئے صاحب عقل و تیز کا کوئی عند سموخ نہیں۔ اس کا جواب تو سرمد پہلے ہی دے چکا تھا۔

”دزدے بخیمے بہرہر کردہ است مرا“

خلیفہ ابراہیم بدخشانی اواخر عہد عالمگیری میں ایک صاحب طریقت بزرگ گزرے ہیں جو ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ تھے اور فتح اشد خاں کے ہاں کہ ابراہیم عالمگیری میں سے تھا نوکر ہو گئے تھے۔ اتفاقاً میر جلال الدین بدخشانی نامی ایک متا حال بزرگ کی اُن پر نظر پڑ گئی اور ان کو فیض پذیر دیکھ کر اپنی تربیت میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی صاحب حال ہو گئے، علم ظاہری کی تحصیل کا کو موقع نہ ملا لیکن مذاق فطری کا یہ حال تھا کہ ثنوی معنوی کا دفتر، ہفتم چار حصوں میں نظم کیا جو درود کیفیت بے لبریز ہے۔ معز الدین جہاند ارشاہ کو ان کی خدمت میں کمال اعتقاد تھا اور ہندستان وکن میں ہزاروں اشخاص ان کے معتقد و ملکہ بگوش تھے۔

والہ داغستانی انھیں بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علماء میں سرمد کو لباس پہننے کے لئے کہا گیا اور مسموم نہ ہوا تو بادشاہ نے علماء سے کہا کہ محض ہنسنگی و قہر تل نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے اور یہ اس لئے کہا کہ بادشاہ سن چکا تھا کہ سرمد کی عادات عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمہ طیبہ جب پڑھتا ہے تو لا الہ سے زیادہ نہیں کہتا، علماء نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لا الہ پڑھا کہ جملہ نفی ہے میں نے علماء نے شور مچایا تو کہا ”ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں۔ مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا۔ اگر لا الہ کوں گا تو جھوٹ ہوگا اور جودل میں نہ ہو و زبان پر کیسے آئے؟“
 علماء نے کہا ایسا کہنا کفر صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سنائی جائیں اور وہ قتل و خون کے احکام سے معوب ہو کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے، اور وہ اس منارہ عشق پر تھا جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں

کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں
کشمورے بہت کہ دروے رو داز کفر سخن

ہمہ جاگفت و شنو بر سر ایمان نہ رود

اور سرد نے تو اپنی اصلی حالت بے کم و کاست بیان کر دی تھی۔ ایمان بالغیب پر جو لوگ قانع نہیں ہوتے اور اس عدم قناعت ہی کا نام تلاش حقیقت ہے وہ اپنے اقرار کو مشاہدہ یعنی سے استوار کرنا چاہتے ہیں اور شاہ حقیقت کی روحانی نقد شہادت ہے جو ابھی سرد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا کیونکر کہہ دیتا کہ ”ہے“ اس ملک کے جتنے رہرو ہیں سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن سرد کا جرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپ کر پیتے ہیں سرد نے علانیہ منہ سے لگایا اور درہ محتسب کا مستحق ٹھہرا۔

خزقہ پوشاں ہمہ گریست گزشتہ گزشت

قصہ ماست کہ در کو چہرہ دبا زار بماند

اور نظر لقمین سے دیکھیے تو یہ اعلان ضروری تھا کیونکہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ نا کہ کا رخ کسی طرف ہوتا دست کا فرما کا فرض تھا کہ اسی طرف پھیرے ۵

منصور را کہ رخصت اظہار دادہ اند

غیر از قصاص محنت زنداں نبودہ شرط

غرض کہ جب سرد نے توبہ نہ کی تو علماء نے بلاتامل فتوے قتل صادر کیا اور دوسرے دن قتل گاہ میں لے گئے۔ بموجب بیان مرآۃ الانجال یہ واقعہ ۱۰۸۰ھ میں ہوا کہ عالمگیری کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا ۵

موبہوم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق

کب آنا آجمن گئے دگر سر و آرم

شاہ اسد اللہ نامی ایک مرد درویش حق آگاہ راوی ہیں کہ :-

”مجھے سترہ کی خدمت میں کمال خصوصیت حاصل تھی۔ جب خورشید

ہنگامہ شروق ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن موت پا کر عرض کیا کہ اگر

اپنی وضع و حالت بدل دیں تو بندگان الہی کی منت و ساجت دیکھتے

ہوئے بظاہر کوئی نقصان نہیں۔ یہ سن کر نظر اٹھائی اور اپنا شعر پڑھ دیا

عمریست کہ آواز دہ منصور کہن مشد

من از سیر فوج سوادہ و ہم دار و رسن را

جب سترہ کو شہادت گاہ لے چلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا اور سقا

بحوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا، عشق کی نیرنگیوں کو کیا کیئے۔ جہاں کا عام پسند

تاشا خوں ریزی ہے۔ جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دلست کھیل نہیں، جب کوئی

سردادہ سر بکٹ بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دولہا کی سواری جا رہی ہے اور

برائیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ پھلتا ہے ۵

بحرم عشق تو ام میکشند و غوغا میست

تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تراشا میست

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ سر بام آنے کی خواہش کی گئی۔ ورنہ سترہ کو سر اٹھانے کی بھی

ضرورت نہ ہوتی۔ جب جلاؤ تلوار اچکا تا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کے نظر مائی اور کہا :-

”خدا لے تو شوم۔ بیا بیکہ تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم۔“

صاحب مرادہ ان خیال راوی ہے کہ اس جملے کے کہنے کے بعد یہ شعر پڑھا اور

مردانہ دار تلوار کے نیچے سر رکھ کر جان دیدی

شورے شد داز خواب عدم چم کشودیم

دیدیم کہ بانی ست شبست نہ غنودیم

صاحبِ مرآۃِ خیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمد کی
 نقشِ خون آلود پر اشک افشانی کرتا۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس سنگیں ولی پر قانع نہ ہو کر
 چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خونریزی بھی عالمگیر کے دفترِ مناقب و فضائل میں جگہ پائے
 حالانکہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے۔ اس کو بھی عشق ہی کی شادی
 گری سمجھئے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم و خونی
 ہونے کی جگہ تحسین و ثواب کا صلہ مانگتے ہیں۔ گویا میدانِ عشق بھی قربانِ گاہِ مینا
 ہے کہ جس قدر بھی خون بہائیے عینِ ثواب ہے۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عیدِ قربان

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب لٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمد کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے یہ اس کا دفن نہیں۔
 صرف شہد ہے۔ لیکن والدہ داغستانی نے تصریح کر دی ہے کہ
 ”در جنب مسجد جامع گردن اور از دند و در ہاں جا دفن کردند۔“

یہ مقام موجودہ مقامِ مزار کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ

”راقمِ حروت بہ زیارتِ مزار وے کمرِ مشرف شدہ ام و در چہار فصل

سبزہ از بُزُنش کم نہ می شود۔ و الحق فیضِ بجے زیارتِ آن منصوبہ ثانی است۔“

والدہ داغستانی عہدِ محمد شاہی میں تھا اور اس کے تذکرے کا سال تصنیف ۱۰۹۰ھ
 ہے۔ لیکن آج بھی شہدِ سرمد زیارت گاہ عوام و خواص ہے اور ہمیشہ فاسحہ کے ہاتھ
 اس کے آگے رو بہ آسمان رہتے ہیں۔

بہر تربت حافظِ چوں گزری ہمت خواہ

کہ زیارتِ گہرِ زنداں جہاں خواہد بود

خلیفہ ابوالہیثم جن کے حالات اوپر گزر چکے ہیں۔ راوی ہیں کہ سرمد نے زندگی میں کلمہ ”لا اِلٰہَ

سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سنا کہ سرِ کشتہ سے تین بار ”اللا اللہ“ کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے علاوہ والدہ داغستانی لکھتے ہیں کہ:-

”ایک ثقہ جماعت سے سنا گیا ہے کہ سرمد کا سرِ مقتول کلمہ طیبہ پڑھتا

رہا اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مردن حمد الہی بھی رہا۔“

موجودہ زمانے میں ایسی روایتوں پر لوگ مشکل یقین لائیں گے اور سوانح نگار کا دُفر ہے کہ خوش اعتقادی کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے، لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہو جانا چاہیے؟ ہم نے بہار میں شگفتہ و شاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ اور خشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہیدِ محقق کے سرِ مقتول کے لب بلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو؟ ممکن ہے کہ سرمد کے بے جان سر سے آواز نکلی مگر اربابِ بصیرت نے اسکی زبان حال کو تو ضرور کلمہ دیکھا ہو گا اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر گئے ہمارے کانوں میں تو اب تک شہدِ سرمد سے صدا آرہی ہے کہ

کس چہ دانند مردِ مژدہاے عشق

منت ایں مرگ برجان من است

عالمگیر ۱۰۹۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور تین سال کے بعد سرمد کی شہادت کا

واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ کبھی لوگوں کا خیال ہے کہ

خونے کہ عشق ریزد ہرگز ہد زبناش

یہ سرمد کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ پیغام اجل بھی آیا تو عالمِ غربت و پریشانی میں مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے لئے تو یہی بہتر

ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملہ میں معذور سمجھیں۔ تاریخ قیاس و ظنون اور شخصی آراء کے مجموعہ کا نام ہے۔ آج چند سیلوں کے فاعملہ پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دونامہ نگار متفق البسیان نہیں ہوتے۔ کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور عالمگیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا؟ پھر یہ بھی ہے کہ خون رنگان عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مند بھٹا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ اُن کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں جب سرینے جلاد سے کہا کہ ”تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم“ تو اسے عالمگیر اور عالمگیری غلام سے کیا شکایت ہوگی؟ بات یہ ہے کہ دیار محبت میں انتقام و دغوی کی شنوائی نہیں اور عشق کے مذہب میں کینہ و عناد سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دیجئے اور ہو سکے تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجئے۔

شہرست سیمینہ ظہوری پُر از محبت یار

برائے کینہ اغیار در دلم جا نیست

سردار کے کلام کا ایک صحیح اور قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے مگر اس وقت پیش نظر نہیں۔ چند سطروں کا ارادہ تھا مگر کئی صفحے ہو گئے اور عشق کی حکایت کب ختم ہونے والی ہو۔ اس لئے چاہتا کہ روح سردار پر دست فاتحہ اٹھا کر خاموش ہو جاؤں۔ آئنہ کبھی موقع ملا تو سردار کا کلام پیش کر دوں گا۔ افسوس ہے کہ یہ داستان مختصر ہو سکی۔ مگر شہیدان محبت کی یاد میں جتنی دیر افسردہ رہ سکے بہتر ہے

لذیذ بود حکایت در از تر گفتم
چنانکہ حرف خصا گفت موسے اندر طور

شائع کردہ : تنویر پبلشرز - لکھنؤ
مطبوعہ : تنویر پریس - لکھنؤ
قیمت : چھ آنے

کتابت و طباعت زیر اہتمام
دانش محل - امین الدولہ پارک - لکھنؤ